Al-Mīthāq*Research Journal of Islamic Theology*
ISSN: 2791-0989 P, 2791-0997 E
Volume 03, **Issue** 01, January-June 2024, **PP**: 293-303
Open Access at:https://almithaqjournal.org/

Article QR

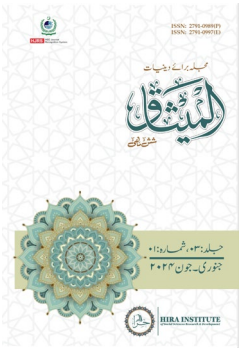

مغرب سے استفادے کی جہات: فکری و عملی تحدیات

Dimensions of Benefiting from the West: Intellectual and Practical Challenges

1. Rifat Sultana
rifatgurmani@gmail.com
Lecturer,
Government Associate College, Kot Sultan, Layyah.

2. Dr. Hafiz Fida Hussain
doctorfidahussain@gmail.com
Deputy Secretary (Finance),
Board of Intermediate and Secondary Education,
Multan.

How to Cite: Rifat Sultana and Dr. Hafiz Fida Hussain. 2024: "Dimensions of Benefiting from the West: Intellectual and Practical Challenges". *Al-Mīthāq (Research Journal of Islamic Theology)* 3 (01): 293-303.

Article History:

Received:	**Accepted**:	**Published**:
25-05-2024	27-06-2024	30-06-2024

Copyright: **©The Authors**

Licensing: This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

Conflict of Interest: Authors declared no conflict of interest

Abstract & Indexing

Publisher

HIRA INSTITUTE
of Social Sciences Research & Development

مغرب سے استفادے کی جہات: فکری و عملی تحدیات

Dimensions of Benefiting from the West: Intellectual and Practical Challenges

1. **Rifat Sultana**
Lecturer, Government Associate College, Kot Sultan, Layyah.
rifatgurmani@gmail.com

2. **Dr. Hafiz Fida Hussain**
Deputy Secretary (Finance), Board of Intermediate and Secondary Education, Multan.
doctorfidahussain@gmail.com

Abstract:

Muslim Scholars of modern age are always looking for an answer to the intellectual question whether following the West should be made as slogan or not? What will be the core principles for social, academic and political interaction and integration with West? What will be the right direction and limits of cultural amalgamation? This has been a dilemma, even a bone of contention among scholars for last many decades. *Muḥammad Asad*, *Mawlānā Maudūdī* and some other scholars extended their views and deliberated discussions on this issue. The opinion of *Mawlānā Maudūdī* creates a crossroads, a path that shows distance and gulf from the West and the others intends to pave a path to connect with the West. Therefore, one of the meanings of this opinion is that we will have to accept the social and economic commitment of the people of the West while using the educational system. As well as the curricular and pedagogical issues of the West if they have contemporary or economic benefits for the people of Islam. The article is an academic and thought-provoking effort to analyse the views of scholars and conclude in balanced manner.

Keywords: *West, Gulf, Modern Age, Cultural Amalgamation, Interaction.*

تعارف

اس وقت تقریباً تمام مسلم ممالک میں ایک ذہنی کشمکش اور جنگ جاری ہے جسے ہم اسلامی نظریات و اقدار اور مغربی افکار و اقدار کے درمیان تصادم کہہ سکتے ہیں۔ ان ممالک کی قدیم تاریخ، مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی و محبت اور جس جذبے سے آزادی کی جنگ لڑی اور جیتی گئی، سب کا دعویٰ ہے کہ اس سرزمین پر صرف اسلامی نظریات اور اقدار کا حق ہے۔ تاہم موجودہ حکمران طبقے کی ذہنی ساخت، تعلیم و تربیت اور ذاتی و سیاسی مفادات کا تقاضا ہے کہ ان ممالک میں مغربی افکار و اقدار کو فروغ دیا جائے، یہ ممالک مغرب زدہ ہوں اور دوسرے ممالک کے نقش قدم پر چلیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جو مذہبی تصورات مزاحم ہیں ان میں ترمیم کر کے انہیں ختم کرنا چاہیے۔

یہاں محمد اسد صاحب کی کتاب "Road to Mecca" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں ان کی فکری گہرائی اور بصیرت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس اقتباس میں انہوں نے بہت خوبی سے اس راستے کی نشاندہی کی ہے جس پر عالم اسلام کو مغرب سے استفادہ کرتے ہوئے جدید مسائل سے نمٹنے کے لیے چلنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں:

> عالم اسلام اور یورپ آج ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں جتنے کبھی نہیں تھے، اور یہی قربت ان دونوں کے درمیان موجود ظاہری اور پوشیدہ کشمکش کا باعث ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد، مرد

اور عورتیں دونوں، مغربی ثقافت کے اثر سے آہستہ آہستہ اپنے روحانی احساسات سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ وہ اس بات سے دور ہوتے جارہے ہیں کہ معیشت کی درستی اور اصلاح صرف انسان کے روحانی احساسات کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ ہے۔ اس کے بجائے، وہ اسی ترقی کے بت کی پرستش کا شکار ہورہے ہیں جس کی وجہ سے یورپ تباہ ہورہا ہے۔ یہ لوگ مذہب کو واقعات وواقعات کے پیچھے ایک فرسودہ آواز سمجھنے لگے ہیں جس کی وجہ سے وہ بلندی کے بجائے ذلیل ورسوا ہورہے ہیں۔[1]

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان مغرب سے سیکھ سکتے ہیں اور اس سے فائدہ نہیں اٹھاسکتے خاص طور پر صنعتی علوم وفنون کے میدان میں۔ علمی نظریات اور اسلوب کو اپنانا درحقیقت تقلید نہیں ہے خاص طور پر اس امت کے لیے جس کے نبی ﷺ نے ہر ممکن طریقے سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة۔[2]

علم حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے۔

علم کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ علم نہ مغربی ہے نہ مشرقی۔ سائنسی ایجادات اور تحقیق ایک نہ ختم ہونے والا عمل ہے جس میں تمام انسانیت یکساں طور پر شریک ہے۔ ہر محقق اور سائنسدان اپنی تحقیق کی بنیاد انہی اصولوں پر رکھتا ہے جو اس کے پیشروؤں نے قائم کیے تھے۔ یہ عمل فرد سے فرد، نسل در نسل اور تہذیب سے تہذیب تک اور تعمیر، بہتری اور ترقی کا کام ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس لیے اگر یہ کام کسی خاص عہد یا تہذیب میں کیے گئے ہیں تو یہ کہنا غلط ہو گا کہ یہ صرف اسی دور یا تہذیب کے ساتھ خاص ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی اور وقت کوئی اور قوم جو زیادہ باہمت اور بہادر ہو، علم کے میدان میں بڑا کردار ادا کرے۔ آخر کار ہم سب اس کام میں برابر کے شریک ہیں۔ ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

ایک وقت ایسا آیا کہ مسلمانوں کی تہذیب یورپ کی تہذیب سے زیادہ شاندار تھی۔ اس نے یورپ کو بہت سی انقلابی صنعتی اور تکنیکی ایجادات دیں۔ مزید برآں، اس نے یورپ کو عملی طریقہ کار کے اصول وضوابط فراہم کیے جن پر جدید سائنس اور تہذیب کی بنیاد ہے۔ لیکن اس کے باوجود جابر بن حیان کی کیمسٹری کو عرب سائنس نہیں سمجھا جاتا تھا حالانکہ الجبرا کے موجد الخوارزمی اور سائنس و کیمسٹری کے بانی جابر ابن حیان دونوں مسلمان تھے۔ اسی طرح نظریہ کشش کو انگریزی سائنس نہیں سمجھا جاسکتا، چاہے اس کا موجد انگریز ہی کیوں نہ ہو۔ یہ عظیم سائنسی کام انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہیں۔[3]

اسی طرح اگر مسلمان صنعتی علوم اور فنون کے لیے ذرائع اختیار کرتے ہیں تو وہ ایسا صرف فطری خواہش، ارتقاء کے جذبے اور دوسروں کے تجربات اور علم سے مستفید ہونے کی خاطر کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مغربی طرز زندگی، آداب، عادات اور مغرب کے اجتماعی تصورات کو اپنائیں گے تو اس کا انہیں ذرہ برابر فائدہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ یورپ انہیں اس میدان میں جو کچھ دے سکتا ہے وہ اس سے بہتر نہیں ہو گا جو ان کی اپنی ثقافت اور ان کے مذہب نے انہیں دیا ہے۔

قیادت کا فقدان

عالم اسلام کا اس وقت سب سے بڑا خلا ایک قائد اور حوصلہ مند انسان کی کمی ہے جو مغربی تہذیب کا جرات، اعتماد اور یقین کے ساتھ سامنا کرے۔ جو اس تہذیب جدید کے مختلف سانچوں، مکاتب فکر اور راستوں کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے۔ ایسا

راستہ جس میں وہ تقلید، نقل، غلو اور انتہا پسندی سے بالاتر اور ظاہری اشکال، مظاہر اور سطحی نقطہ نظر سے بلند ہو۔ جیسا کہ ابو الحسن علی ندوی کا کہنا ہے:

> وہ عظیم دماغ اور بہادر انسان جو مغربی تہذیب اور اس کے تمام نظریات، انکشافات اور قوتوں کو خام مال کے طور پر استعمال کرتا ہے اور اس سے ایک نئی اور طاقتور تہذیب کی تعمیر کرتا ہے۔ ایمان، اخلاق، تقویٰ، احسان اور انصاف پر مبنی تہذیب۔ وہ مغربی تہذیب کو اس نظر سے نہ دیکھے کہ اس میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اسے سارے عیوب کے ساتھ قبول کرنا ہی واحد راستہ ہے، بلکہ وہ مغربی تہذیب کو اس کے عیوب سمیت بہتر بنانے اور اس سے نئی راہیں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔[4]

مغرب سے استفادہ کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی سہولتوں، دریافت کردہ سائنس و ٹیکنالوجی، ایجادات اور تفریح و سہولت کے وسائل کو مکمل طور پر حرام قرار دے کر اس دروازے کو بند نہ کیا جائے۔ اسلام ہمیشہ سے وسیع ذہن کا حامل اور ہر فائدہ مند چیز سے استفادہ کے بارے میں فراخ دل اور کشادہ نظر رہا ہے۔ دوسری جانب موجودہ تمدنی سہولتوں، جدید آلات و ایجادات اور سائنس ترقیات سے استفادہ اور اسلامی تمدن کے حسن و سادگی کے اخلاقی اصولوں اور معاشرتی تعلیمات کا کاربند رہنا ممکن اور قابل عمل ہے مگر تب جب اسلامی حکومتوں اور معاشروں کو آزادانہ و مجتہدانہ فکر و نظر اور جرات مندانہ منصوبہ بندی کی توفیق ملے۔ یہ منصوبہ بندی اتنی بہترین، اعلیٰ اور جاذب نظر ہو گی کہ بیرونی مفکرین اور دانش ور اس کثرت سے اسلامی شہروں کا رخ کریں گے جتنی کہ آج تفریح کرنے والے بھی نہیں کرتے۔

عالم اسلام کے اس خلا کو پر کرنے کے لیے ایک جرات مند قیادت کی ضرورت ہے جو مغرب کے ظاہری خول میں نہ الجھے بلکہ وہ مغرب کی ٹیکنالوجی آسائش و سہولیات کو استعمال کرتے ہوئے ایک بہترین تمدن اور خالص اسلامی تہذب کی عکاسی کرے اور اس سے وہ زندگی وجود میں آئے جس کے متعلق قرآن نے شہادت دی ہے:

> وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔[5]
>
> جو شخص نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو ہم دنیا میں بھی اس کی زندگی اچھی بسر کرائیں گے اور ان کو آخرت میں ان کے بہترین اعمال کا صلہ ضرور عطا فرمائیں گے۔

حوصلہ مند انسان مغرب سے وہ علوم حاصل کرے جو اس کی قوم اور ملک کے لیے ضروری ہیں، جن کے اندر کوئی عملی افادیت ہے اور جس پر مغرب و مشرق کسی کی چھاپ نہیں۔ وہ محض تجربی اور عملی علوم (Sciences) کہے جاسکتے ہیں۔ وہ مفید علم کو الحاد، مذہب بیزاری اور غلط نتائج سے پاک اور آزاد کر کے حاصل کرے۔ وہ کوشش کرے کہ اپنی ذہانت، مشرق و مغرب، مادی روحانی قوتوں کے اس حسین امتزاج سے ایک ایسی شاہرہ اور ملک زندگی پیدا کرے جس کا احترام اور اس کی تقلید کرنے پر مغرب بھی مجبور ہو۔ مشرق کے وہ رہنما جو اس نصف صدی کے عرصے میں ابھرے ہیں کوئی بھی اس اعلیٰ معیار پر پورا نہیں اترتا اور کوئی بھی اسے پورا نہیں کرتا جو ہمارے وقت کی سب سے بڑی ضرورت بن گئی ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے کہ:

نہ مصطفی، نہ رضا شاہ میں ہے اس کی نمود
کہ روح مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی۔[6]

جدید دور میں جب کہ مغربی تہذیب اپنے ارتقاء کے آخری موڑ پر پہنچ چکی ہے۔ مسلم ممالک اپنے مخصوص حالات اور تاریخ کی وجہ سے اس میں یکساں طور پر شریک نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ ممکن بھی ہو تو ان کے لیے اپنے عقیدہ، مذہب، مقاصدِ زندگی اور مخصوص نوعیت کی بنا پر ایسا کرنا جائز اور ممکن نہیں۔ یہ ان کی اجتماعی موت و خودکشی کے مترادف ہے۔ یہ نہ صرف ان ممالک کی شان ہے بلکہ یہ جدید تاریخ کا ایک عظیم انقلاب ہے۔ وقت کا سب سے اہم اور مقدس کام جدید تہذیب کی رہنمائی کرنا، اس میں نئی زندگی پھونکنا، اسے نبوت کی عطا کردہ ایمان و محبت کی دولت سے آشنا کرنا اور اس کی اصلاح کی خدمت ہے۔ یہ کام صرف مسلم ممالک ہی کر سکتے ہیں جس کی ہمت اس دور میں کوئی نہیں کر رہا۔ جیسا کہ سید قطب شہید رقمطراز ہیں:

> اسلام نے خواہشات نفس کی غلامی سے آزادی پر اس لیے بہت زور دیا ہے مگر اس غرض سے وہ اپنے پیروؤں کو نہ تو رہبانیت اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ان کو اچھی اور پاکیزہ چیزوں سے متمتع ہونے سے روکتا ہے۔ وہ ان دو انتہاؤں کو چھوڑ کر وہ بیچ کی راہ اعتدال اختیار کرتا ہے۔ اسلام انسان کو بتاتا ہے کہ جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں ہے جہاں کے لیے۔ انسان کا مقصد حیات خدا کے دین کی تبلیغ و ابلاغ ہے اور انسانیت کی تکمیل کی وہ واحد راہ یہی ہے۔[7]

اسلام اور مغرب تعاون کے امکانات

اس وقت مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان ممالک کا مغربی تہذیب کی طرف رویہ کیا ہے، وہ اپنے معاشرے کو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ کرنے اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے کیا راستہ اختیار کرتے ہیں، اس میں کسی حد تک ذہانت اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وہ کس طرح اسلام کی رسومات پر پوری طرح عمل کرتے ہیں۔ وہ دنیا پر اپنا وجود اور مقام قائم کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ۔[8]

اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

آیت کریمہ سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اہل اسلام کسی بھی صورت اپنے ایمان اور عقائد تبدیل نہ کریں۔ یعنی سیاسی، معاشرتی یا مذہبی طور پر یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے ساتھ اگر روابط کے خواہش مند ہوں تو اس پر اہل اسلام کو بارہا تفکر اور غور و خوض کرنا چاہیے آیا کہ ان کے اس رابطے کی وجہ یا تعاون کی خواستگاری کا سبب مسلمانوں کو ضلالت و گمراہی میں ڈالنے کا تو نہیں، کہیں وہ مسلمانوں کے ایمان کی تجارت تو نہیں کرنا چاہ رہے۔ اس لیے اسلام اور اہل مغرب کے درمیان ہمیشہ سے ایک خلیج چلی آ رہی ہے۔ اور اس خلیج کے کئی بار کم ہونے کے امکانات بھی بڑھے ہیں اور کبھی کبھار یہ فاصلے اتنے زیادہ بھی ہوئے کہ اسلام اور مغرب کا قربت اور رفاقت کے حوالے سے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی صلیبی جنگوں میں صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں مسجد اقصیٰ کی بازیابی کے بعد مغرب اور اسلام کے درمیان کشیدگی بڑھی ہے۔ کسی دور میں سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد اہل مغرب مسلمانوں کو قابل ترس سمجھنے لگے اور کبھی اٹلی کی فوجوں کے ہاتھوں طرابلس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد مسلمان قابل مذاکرات سمجھے جانے لگے۔ ترکی میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد جب انگریزوں کی سازشیں کامیاب ہوئیں تو اس کے بعد بھی اسلام اور مغرب کے فاصلے بڑھتے چلے گئے۔ تو مسلمان اہل مغرب اور انگریزوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن گردانے لگے۔ اسی طرح نائن الیون کے واقعات کے بعد اہل مغرب خود ہی مسلمانوں سے فاصلہ رکھنے اور عدم تعاون کے لیے آمادہ نظر آنے لگے۔ اس حوالے سے معروف تجزیہ نگار اظہر لودھی کا کہنا ہے:

اہل مغرب اور بالخصوص امریکی حکومت یہ سمجھتے ہیں کہ پینٹا گون اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے پیچھے مسلمان جہادیوں کا ہاتھ ہے اور اس کے پیچھے انھوں نے یہ مفروضہ بھی قائم کر لیا کہ مسلمان حکومتیں چاہے وہ ایشیائی ہوں یا عرب مسلمان جہادیوں کی دامے درمے قدمے سخنے سے امداد بھی کر رہی ہے۔ لہذا مغربی قوتوں کے نزدیک ان کی بقا اور ان کی آنے والی نسلوں کے تحفظ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسلام کو پھلنے پھولنے سے روکا جائے اور مسلمان حکومتوں پہ کڑی سے کڑی پابندی لگائی جائے۔[9]

اظہر لودھی جو کہ ایک سینئر سیاسی اور دفاعی تجزیہ نگار گزرے ہیں کی یہ رائے ظاہر کرتی ہے کہ فی الواقع مغربی اقوام اس مخمصے کا شکار ہیں کہ اسلام اور مسلمان ہی مغرب کے درپے ہیں۔ یہ ان کی خام خیالی ہے کہ اسلام کے نام لیوا چند نام نہاد جہادی کبھی نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی ان کے غلط قدم سے اہل مغرب کو اسلام سے مسابقت یا عداوت رکھنی چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا میں امن اور سلامتی کی خاطر اسلام اور مغرب کے فاصلوں کو کم سے کم کیا جائے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے وگرنہ اہل مغرب بھی عقل کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائیں گے اور اسلام بھی نئے راستے نئی منزلیں تلاش کرنے میں سست روی کا شکار ہو جائے گا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۔[10]

یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک ہر گز راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ان کی ملت کی اتباع نہ کریں۔

سید قطب شہید ایک جگہ رقمطراز ہیں:

انسان کی اپنے بارے میں جہالت کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ سے متصل اور اس کے قریب رہے، اس سے مدد مانگتا رہے اور اس کے فاضل کردہ علم و حکمت پر مبنی ہر ہدایت پائے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ مادی دنیا میں اپنی عقل اور علم اور مادی صنعتوں میں اپنی مہارت سے فریب نہ کھائے۔ خواہ اس کی صلاحیتیں کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائیں اور وہ اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگے کہ اس نے میدان میں معجزے دکھائے ہیں۔ یہ فریب انسان کو مجبور کر دے گا کہ وہ انسان مادی دنیا میں اپنے تجربات کو عالم حیات اور خاص طور پر انسانی زندگی پر منطبق کر لے۔ وہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر بلکہ اللہ کے طریقے سے دشمنی اور روگردانی کی بنیاد پر اپنے لیے خود ضابطہ حیات متعین کرے۔ مگر جو کچھ یورپ میں ہوا اور جو وبا یورپ سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئی وہ اس کے برعکس ہے۔ اس کے نتیجے میں گمراہی اور بدبختی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اب انسانیت ہلاکت اور تباہی کے غار میں لڑھک رہی ہے۔ انسانی وجود اس سخت مصیبت سے دوچار ہے۔[11]

سید قطب شہید کے کہنے کا یہ مقصد ہے کہ ہم مغرب کو یہ باور کرانے میں ناکام ہو چکے ہیں کہ سائنس یا مادیت کی ترقی حقیقی ترقی ہے یا اگر ہم نے ان کو کسی طرح باور کرایا بھی ہے تو وہ معاشرے ابھی تک اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ اسلام اور مغرب کے درمیان خلیج کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ اہل مغرب نے ہمیشہ سے یہ گمان رکھا ہے کہ اسلام ایک قدامت پسندی اور بنیاد پرستی کا مذہب جس نے ہمیشہ انسان کو ترقی کی راہوں پر چلنے سے روکا ہے۔ انسان کی عقل کتنی ہی رفعت تک نہ پہنچ جائے۔ اور وہ اس زمین پر کتنی ہی معجزات دکھا دے مگر اس حقیقت سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتی کہ روحانی اور اخلاقی قدریں بھی اپنا ایک جواز رکھتی ہیں۔ بحث و تحقیق، تنقید و تقاریر اور مکالمہ و مناظرہ چاہے کتنا ہی عروج پر کیوں نہ چلا جائے۔ انسان کی طبیعت

اور مزاح میں جو روحانی اور اخلاقی کشش رکھی گئی ہے اس سے گریز نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام اور مغرب کا تصادم کسی بھی طور پر نہیں بنتا۔ لیکن کچھ عناصر اس کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی سیاست کے میدان میں اسلام کو مغرب کا بڑا دشمن قرار دیا جاتا ہے، کبھی معیشت کی راہداریوں پر چلتے ہوئے اسلامی شعائر کو اور قوانین الٰہی کو معاشی ترقی میں خارج قرار دیا جاسکتا ہے، اور کبھی اپنی تہذیبی و تمدنی جدت اور تعیش پسندی کی زندگی کی بقاء کی خاطر اسلام پر دقیانوسیت اور جمودیت کے سنگین الزامات لگائے جاتے ہیں۔ یہ سب حقائق اپنی جگہ پر مگر یہ بات اٹل ہے کہ اسلام اپنے عقائد اور ضابطوں کے اعتبار سے دین کامل اور ہے اور زندگی کے ضابطوں کو تدبر و فراست سے بیان کرتا ہے۔ ہمیں ان امور کا جائزہ لینا ہوگا کہ جن کے تحت اسلام اور مغرب کے مابین تفاوت کو ختم اور انہیں قریب لایا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے مناظرہ اور مکالمہ کی حیثیت کو تسلیم کرنا اور یہ ماننا ہوگا کہ آپس میں مکالمہ کی فضا ساز گار بنا کر اسلام کے آفاقی پیغام کو اہل مغرب تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ مولانا مودودی کہتے ہیں:

آج کا سائنسی آدمی عیسائیت کو بالکل سمجھ چکا ہے۔ اور اس پر واضح ہو گیا کہ یہ اس کی بیماری کا علاج نہیں ہے۔ کوئی ہندومت اور بدھ مت کے تخیلاتی فلسفوں اور ان کی تاریخی قدامت پسندی سے متوجہ ہوتا ہے۔[12]

مودودی صاحب کی یہ رائے اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہے کہ اہل مغرب کے ہاں عیسائیت اور یہودیت قدامت پسند مذاہب کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ مگر کسی نہ کسی حد تک بدھ مت اور ہندوازم کی اساطیری اور دیومالائی باتوں سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ ان مذاہب کو لطفِ طبع کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جب اسلام کی بات ہوتی ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام نے مناظرے اور مکالمے کے ذریعے اہل مغرب کے دل میں جگہ بنائی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كنتم خير أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۔[13]

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے نکالے گئے ہو۔

اسی طرح اس دین حکمت کے ماننے والوں کو خدائے بزرگ و برتر نے واضح طور پر حکم دیا ہے کہ:

وادْعُ إِلى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الحَسَنَةِ ۔[14]

دعوت دو اللہ کے راستے کی طرف دانائی اور وعظ و نصیحت کے ساتھ۔

اسلام کی اسی تربیت اور انداز تبلیغ نے اسلام کے پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دوسری طرف مکالمہ اور مناظرے کی فضا نے اہل مغرب کے باشعور اور خرد مند لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا ہے۔ ایک بات کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے نشر و اشاعت کے شعبے میں کوئی خاص مہارت نہیں دکھائی۔ خصوصاً پرنٹ میڈیا کے ذریعے اسلام کے منہج کو اہل مغرب تک پہنچانے کی جو ضرورت تھی اسے صحیح طور پر نہیں نبھایا گیا۔ اس بات کا اندازہ "کرانکل آف اسلام" کے اس انکشاف سے ہوتا ہے کہ اس وقت عیسائیت کی تبلیغ کے لیے امریکہ اور یورپ میں سولہ ہزار سے زائد چھوٹے اور بڑے رسائل جاری کیے جاتے ہیں۔ جبکہ اسلامی رسائل کی تعداد محض 60 تک محدود ہے۔ اس لیے اہل اسلام کو باہمی تدبر اور فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسا لائحہ عمل بنانا ہوگا کہ جس سے اسلام کا پیغام پرنٹ میڈیا کے ذریعے اخبارات، رسائل و جرائد کے توسط سے مغربی دنیا تک پہنچایا جاسکے۔ اس امر کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس وقت مغرب کے ہاں یہ بیانیہ شد و مد کے ساتھ رواج پکڑ رہا ہے کہ اسلام دلیل اور منطق کا مذہب نہیں۔ اہل مغرب کو لٹریچر کے ذریعے قریب لانے کے لیے ایسے اقدامات اٹھانا ہوں گے کہ جس کے ذریعے اسلام کا واضح چہرہ اور اس کا مجموعی خدوخال اہل مغرب کے سامنے آسکیں۔ مناظرہ اور مکالمہ کی ضرورت کے حوالت سے ڈاکٹر سرار احمد کہتے ہیں:

بین المذاہب ہم آہنگی اور یک جہتی کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس وقت خدا کی دھرتی کا امن بحال رکھیں اور اس کے لیے ہمیں ایک دوسرے کے قریب آنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے "آؤ تمہارے اور ہمارے درمیان جو چیزیں مشترک ہیں ان پہ متفق ہوں۔" اسی تناظر میں ہمیں اہل مغرب کو باور کرانا ہو گا کہ اسلام مکالمہ اور مناظرہ پہ یقین رکھتا ہے۔ اسلام کو بغور سمجھنے کی یہی ایک سبیل ہے کہ اس کے ماننے والوں کے ساتھ مناظرے اور مکالمے کی فضا ہموار کی جائے۔[15]

ڈاکٹر اسرار احمد کی یہ بلیغ رائے اس حقیقت کا پیش خیمہ ہے کہ ہمیں بطور انسان ایک دوسرے کے قریب آنا ہو گا۔ اسلام کے پیغام کو مغرب تک پہنچانے کا یہی ایک بہترین حل اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بھی ہے۔ در حقیقت مذہبی ہم آہنگی اور بین الاقوامی ربط وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اسی لیے اکثر مذاہب کے ہاں برداشت، رواداری اور تحمل و بردباری کا درس ملتا ہے۔ اس حوالے سے سید قطب شہید کہتے ہیں:

انسانیت کبھی اپنے ضابطہ زندگی کو تسلیم نہیں کرتی جو سنا سنایا ہو یا جو صرف مطالعہ کیا جا سکے۔ بلکہ انسانیت صرف اسی منہاج کو تسلیم کرتی ہے جو زندہ اور متحرک ہو، اپنی مجسم شکل میں انسانوں کی ایک جماعت میں عملاً جلوہ گر ہو، اسے آنکھیں دیکھ سکیں ہاتھ چھو سکیں اور اس کے آثار عقل محسوس کر سکے۔ انسانیت اگر اسلامی منہاج زندگی کو اپنا سکتی ہے تو اس سے مشاورت بھی کر سکتی ہے۔ اسلام کے بارے میں ہزاروں تصنیفات، مسجدوں میں سینکڑوں تقریریں اور دعوت و اسلام کے لیے بنائی گئی متعدد فلمیں یہ سب کچھ مغربی معاشرے کے لیے بھی مشعل راہ ہو سکتی ہے۔[16]

قطب شہید کی یہ رائے اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اسلام تباہی کے دہانے پر کھڑی انسانیت کی نجات کا ذریعہ ہے۔ اس طرح بے عملی اور بد اخلاقی کے مشکل ترین دور میں فطرت کی پکار کا جواب صرف اسلام ہی ہے۔ پھر سید قطب شہید کی یہ بات بھی وزن رکھتی ہے کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کو اگر کسی نہ کسی صورت اہل مغرب اپنا نہیں سکتے تو محض اس پر اچکتی سی نگاہ ہی ڈال لیں، یا صرف اپنے مکالمے اور اپنے مناظرے کا حصہ ہی بنالیں تو بھی مذہبی ہم آہنگی کی ایک بہترین صورت نکل سکتی ہے۔ جس طرح ڈاکٹر ذاکر نائیک نے اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کلکتہ میں 2004ء میں ایک قرآن اور بائیبل کے اختلافات اور مشترکات کے موضوع پر یہودی، عیسائی اور مسلمان علماء کا مکالماتی پروگرام منعقد کیا تھا۔ اسی طرز پر اہل مغرب میں بھی کئی سنجیدہ کنونشن منعقد کرائے گئے۔ امریکی ریاست ہوائی کے دارالحکومت ہونولولو میں ایسٹ اینڈ ویسٹ سنٹر کے توسط سے دنیا بھر کے علماء اور اسکالرز کو مدعو کیا جاتا ہے۔ وہ تحقیقی اور تخلیقی کام کرتے ہیں۔ اس فضا میں مذاہب کے مابین ایک نیا ربط دیکھنے کو ملتا ہے۔

سماج و ثقافت کے ضمن میں درپیش تحدیات و تدارک

سماجی اور ثقافتی طور پر مغرب اور اسلام کے درمیان بہت سی خلیجیں حائل ہیں۔ جب ثقافت کی تعریف کی جاتی ہے تو انگریزی کے لفظ Culture کلچر کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ Culture کا لفظ اپنی اصلیت کے اعتبار سے Cultivation سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب زمین کو زرخیز کرنا ہے۔ ایک لحاظ سے انسانی اعمال اور رویوں میں ترتیب اور آرائش کا نام ہی Culture ہے۔ انسان دراصل ایک خاص حد تک فطرت کے قواعد و ضوابط اور پابندیوں کو برداشت کرتا ہے۔ انسان اپنے ارد گرد اخلاقی اور سماجی ضابطوں کو توڑنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے خواہ وہ مذہب نے متعین کیے ہوں یا پھر مذہب و معاشرے کے سرکردہ رہنماؤں نے۔ وہ

انسان کی تربیت پر ہمیشہ سے گراں گزرے ہیں۔ اسی حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں مغرب کے سماجی اور ثقافتی مزاج کو سمجھنا ہو گا کیونکہ ہم اس امر سے باخوبی واقف ہیں کہ اہل مغرب کے ہاں آزادی فکر و عمل بہت زیادہ حد تک بڑھی ہوئی ہے اور بسا اوقات یہ آزادی اس قدر لا محدود ہو جاتی ہے کہ انسان مذہب اور خدائی حدود کو توڑتا ہوا ایک باغی اور روایت شکن کے روپ میں سامنے آتا ہے اور ثقافت کثافت بن جاتی ہے۔ اس ضمن میں سید ابو الاعلیٰ مودودی کہتے ہیں:

> مغربی اقوام نے سیاست، تجارت، صنعت و حرفت، ثقافت و سائنس و فنون کے میدان میں جو حیرت انگیز اقدامات اٹھائے ہیں ان کو دیکھ کر دل و دماغ پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور لگتا ہے کہ ان قوموں کی ترقی لازوال ہے۔ دنیا پر ان کا غلبہ اور تسلط ہمیشہ کے لیے طے ہو چکا ہے۔ ان کی ثقافت کے بھی رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ دراصل یہ ثقافت اور تہذیب نہ صرف خود بدلتی رہتی ہے بلکہ کبھی ان کی ثقافتی بنیادوں میں بھی تغیر و تبدل دکھائی دیتا ہے۔[17]

مولانا مودودی کی اس رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ثقافت اکثر و بیشتر اپنی ڈگر سے ہٹ جاتی ہے۔ ثقافت اپنانے والوں کو بسا اوقات اپنے سماج سے جوڑے رکھنے کی بجائے دور لے جاتی ہے۔ مختلف ثقافتوں میں یہ فرق اور امتیاز لازمی سی بات ہے۔ سید قطب شہید رقمطراز ہیں:

> جدید تہذیب کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کے مسائل کسی دوسرے معاشرے کے مسائل سے مختلف ہوں گے اور اسلامی معاشرے کے جو مسائل اس وقت موجود نہیں ان کا حل اسی وقت تلاش کیا جا سکے گا۔ یہ مسائل اپنی خاص شکل و صورت اختیار کریں گے اور اس وقت کے حالات کے مطابق ہوں گے جب اسلامی معاشرہ قائم ہو گا۔ اسی طرح ثقافتی طور پر اسلام اپنے لوگوں کے مسائل کو سمجھنے کے بعد ان کی ثقافت میں ضم کر دینے کا قائل ہے۔[18]

سید قطب شہید کا یہ کہنا بجا ہے کہ اسلام کی ثقافت ہمہ پہلو اور ہمہ رنگ ہے۔ یہ اسلامی ضابطوں میں رہ کر پنپ اور پرورش پا سکتی ہے۔ اسلام سے ہٹ کر بھی اسے مخصوص سماجی تناظرات میں سمونے کی کوشش کی جائے تو بھی ایسی ثقافت کو اسلام کی نظر میں جاندار اور روا سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی ثقافت کی تشکیل خاص عناصر یا اجزائے ترکیبی کی ہرگز محتاج نہیں اور ایسی لچک دار اور قابل قبول ثقافت ہی اہل مغرب کی دائمی ترقی اور کامیابی کا سبب بن سکتی ہے۔ لہذا اہل مغرب کو چاہیے کہ وہ ثقافتی حوالے سے بھی مسلمانوں اور اسلام کو اپنے قریب لائیں تاکہ ثقافتی حوالے سے اسلام اور مغرب کا باہمی تبادلہ ممد و معاون ثابت ہو سکے۔

مسلم امہ کے جہاں دیگر مسائل ہیں وہیں پر ایک مسئلہ اہل مغرب سے حد درجہ فاصلہ رکھنا بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض مسلم دانش وروں کے نزدیک یہ بہتری کی بنیاد ہو لیکن در حقیقت عصر حاضر جو اپنے اندر بے پناہ وسعتیں اور دشواریاں لا رہا ہے اس سے کسی نہ کسی صورت نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ یہ اسلام کے ارتقاء کے لیے بھی ضروری اور اس عہد پر آشوب میں مسلمانوں کی جہاں ساتھ پہلے اتنی خراب ہو چکی ہے وہاں پر قرب و جوار سے غفلت انگیزی اور دیگر ممالک اور معاشروں کے ساتھ ربط ضبط بھی لازم ہو گیا ہے۔ اس حوالے سے ابو الاعلیٰ مودودی کہتے ہیں:

> جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی برائیوں کا علاج جدید معاشی حالات کی اصلاح اور سیاسی حقوق کا حصول ہے۔ بخدا اگر مسلمانوں کا ہر فرد ایم۔ اے، پی۔ ایچ ڈی اور بیرسٹر ہو جائے، دولت سے مالا مال ہو، مغربی فیشن میں ملبوس، پس اگر ان کے دلوں میں نفاق ہے تو وہ فرض کو فرض نہ سمجھیں اور مغرب کے ساتھ اپنی وابستگی کو

ختم کر دیں تو اسی پستی، ذلت اور کمزوری میں مبتلا رہیں گے جس میں وہ پہلے بھی مبتلا تھے۔[19]

مودودی صاحب کی یہ رائے ایک دوراہ پیدا کرتی ہے۔ ایک راہ ایسی جو مغرب سے دوری اور خلیج دکھاتی ہے اور دوسری راہ مغرب کے ساتھ جڑے رہنا چاہتی ہے۔ لہذا اس رائے کا ایک مطلب ظاہری طور پر ہم یہ لیں گے کہ تعلیمی مساعی کو بروئے کار لاتے ہوئے اہل مغرب کی معاشرتی اور اقتصادی وابستگی کو قبول کرنا ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ مغرب کے نصابی اور تدریسی معاملات کو اگر وہ اہل اسلام کے لیے عصری یا معاشی حوالے سے منفعت رکھتے ہیں، قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ دراصل صورت حال اس وقت گھمبیر ہو جاتی ہے جب ہم یعنی مسلم معاشرے کے لوگ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ مغرب ہماری اسلامی ثقافت کو ہی نہیں بلکہ ہمارے عقائد اور شعائر کو مٹانے کے درپے ہے۔ پھر مسائل کا حل نکلنے کے بجائے مغرب سے دوری بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ سید قطب شہید کہتے ہیں:

> یورپی تہذیب و تمدن کی چمک دمک کے کوئی پہلو ایسے نہیں جو اصل اعتبار سے اسلامی تہذیب سے متاثر نہ ہوں۔ نئی دنیا کی ممتاز ترین قوت اور موجودہ تمدن کی اصل یعنی طبیعی علوم اور علمی بحث کی روح میں بھی یہ اثرات بہت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔[20]

جب یہ رائے طے کرتی ہے کہ یورپی تمدن اور مغربی تہذیب پر اسلامی ثقافت کے اثرات مرتب ہوتے رہے ہیں اور مغربی معاشرے کسی نہ کسی پہلو سے فیض اٹھاتے رہے پھر کیوں مغرب سے دوری رکھنے اور فاصلہ بڑھانے کی بات کی جاتی ہے؟ اگر اہل مغرب اسلام اور اس کے ماننے والوں کے تمدنی اور ثقافتی زاویوں کو اپناتے ہیں تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بھی مغرب کے ان پہلوؤں کو خود سے جوڑنے کی کوشش کریں جس کے ذریعے ہم میں علمی اور اخلاقی حوالے سے مثبت تبدیلی وارد ہونے کی امید دکھائی دے سکتی ہے۔ لہذا اس بحث میں پڑے بغیر یہ حقیقت مان لینی چاہیے کہ آج کا زمانہ اس بات کا شدت سے متقاضی ہے کہ مشرق و مغرب اور اسلام و یورپ کے مابین باہمی مفادات اور وسیع تر امن عالم کے لیے فاصلے کم کرنا ہوں گے۔

حاصل بحث

مغرب سے استفادہ کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی سہولتوں، دریافت کردہ سائنس و ٹیکنالوجی، ایجادات اور تفریح و سہولت کے وسائل کو مکمل طور پر حرام قرار دے کر اس دروازے کو بند نہ کیا جائے۔ اسلام ہمیشہ سے وسیع ذہن کا حامل اور ہر فائدہ مند چیز سے استفادہ کے بارے میں فراخ دل اور کشادہ نظر رہا ہے۔ دوسری جانب موجودہ تمدنی سہولتوں، جدید آلات و ایجادات اور سائنس ترقیات سے استفادہ اور اسلامی تمدن کے حسن و سادگی کے اخلاقی اصولوں اور معاشرتی تعلیمات کا کاربند رہنا ممکن اور قابل عمل ہے مگر تب جب اسلامی حکومتوں اور معاشروں کو آزادانہ و مجتہدانہ فکر و نظر اور جرات مندانہ منصوبہ بندی کی توفیق ملے۔ اس حقیقت کو مان لینے میں کوئی تامل نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت اہل مغرب کے پاس نہ کوئی ضابطہ ہے، نہ کوئی لائحہ عمل اور نہ ہی کوئی مذہبی، اخلاقی منشور۔ لہذا اگر مغربی معاشرے کے دانش مند طبقے کے لوگ ان کے اصلاح کار اسلام کے قریب آنا چاہتے ہیں یا اسلام کو ایک منتخب کردہ آپشن میں رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے اسلام کے بہت سے افادی پہلو مغربی معاشرے میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسلام کے پیروکار اور اسلامی دانش اور اس بہانے مغربی معاشرے کے مسائل کو سمجھ لیں گے اور افہام و تفہیم کی اس فضا میں اسلام اور مغرب کے فاصلے کم ہوں گے۔ نتیجتاً اس طرح امن عالم کو استحکام ملے گا۔

حوالہ جات وحواشی

1 محمد اسد، **Road to Mecca**، مترجم: طوفان سے ساحل تک، (لکھنؤ: تنویر پبلشرز، 1961ء)، ص187۔

2 ابن ماجۃ، محمد بن یزید، **السنن**، (ریاض: دارالحضارۃ للنشر والتوزیع، 2015ء)، کتاب السنۃ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، رقم الحدیث:224۔

3 ندوی، ابوالحسن علی، **مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش**، (لکھنو: ادارہ تحقیقات ونشریات اسلام، 2010ء)، ص292۔

4 ایضا، ص299۔

5 سورۃ النحل16:97۔

6 محمد اقبال، علامہ، **بانگ درا**، (لاہور: نیاز احمد پبلشرز، 1977ء)، ص35۔

7 سید قطب، شہید، **اسلام اور جدید ذہن کے شبہات**، (لاہور: البدر پبلکشینز، 1981ء)، ص26۔

8 سورۃ المائدۃ5:51۔

9 اظہر لودھی، **اسلام اور مغرب نیا منظر نامہ**، (کراچی: نقاش پبلشرز، 2004ء)، ص13۔

10 سورۃ البقرۃ2:120۔

11 سید قطب، شہید، **اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل**، (لاہور: البدر پبلکشینز، 1981ء)، ص40-41۔

12 مودودی، سید ابوالاعلیٰ، **تنقیحات**، (لاہور: ترجمان القرآن پبلی کیشنز، 2016ء)، ص91۔

13 سورۃ ال عمران3:110۔

14 سورۃ النحل16:125۔

15 اسرار احمد، ڈاکٹر، **ندائے خلافت**، (لاہور: تنظیم اسلامی، 2004ء)، ص112۔

16 سید قطب، **اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل**، ص190۔

17 مودودی، **تنقیحات**، ص63۔

18 سید قطب، **اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل**، ص194۔

19 مودودی، **تنقیحات**، ص222۔

20 سید قطب، **اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل**، ص43۔